Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

Received: 20th Feb, 2024 | Accepted: 16th June, 2024 | Available Online: 30th June, 2024
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v16i01.391

ناسٹلجیا کے تناظر میں ناول "آگے سمندر ہے" کا مطالعہ

A Study of the Novel "Aagy Samadar Hai" in the Perspective of Nostalgia

SAQLAIN AHMAD KHAN (SAQLAIN SARFRAZ)[1] AND MUHAMMAD BURHAN HASSAN[2]

[1] Lecturer Urdu, Islamia University Bahawalpur, Pakistan
[2] Visting Lecturer Urdu, Government College University Lahore, Pakistan
Corresponding author: Muhammad Burhan Hassan (mianburhanhassan@gmail.com)

ABSTRACT The memories of the past, called nostalgia in terms of literature, can be the primary motivation for human life. A lot has been written about it in the literature; nostalgia also has profound effects on Urdu literature. Those who directly experienced the division of the subcontinent have made it the subject of their writings. There are many effects of nostalgia in the novel "Aagy Samandar Hai" How the partition destroyed the houses and then how the people tried to rebuild them, what mental agonies they went through, how many psychological and physical difficulties they faced in leaving the land of their ancestors, and What is the tragedy of memory. All of this has been tried to be considered in this article.

Keywords Novel, Nostalgia, Partition, Memories of childhood, Psychological, Ancestors, Fear.

جب سے دنیا معرضِ وجود میں آئی ہے، ہر گزرنے والا دن یاد میں تبدیل ہوتا جارہا ہے۔ ہر وہ چیز جو انسان سے تعلق رکھتی ہے، کسی نہ کسی طرح انسان کے تحت الشعور میں بیٹھ جاتی ہے۔ ہر تخلیق کار اپنے فن پارے میں کہیں نہ کہیں اپنے ماضی میں پیش آنے والی واردات، تجربات اور حادثات کو الفاظ کے ذریعے قاری کے سامنے پیش کرتا ہے، اور اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو تمام تواریخ ماضی اور یادداشت کے ارد گرد گردش کرتی ہیں۔ یہ ایک فطری عمل ہے کہ انسان اپنی جائے پیدائش، بچپن، لڑکپن، عزیز و اقارب علاقہ اور دیگر تمام اشیاء جو اس سے تعلق رکھتی ہیں ان چیزوں کو وہ تادم آخر یاد رکھتا ہے۔

ماضی کے لمحات کو میسر لمحے میں دریافت کرنا ناسٹلجیا کہلاتا ہے۔ علمِ نفسیات میں یہ اصطلاح نفسیاتی و ذہنی امراض میں مبتلا مریضوں کے علاج کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ ایسا مرض ہے جس میں مریض اپنے ماضی کی کرب ناک یادوں میں مبتلا ہو کر حال میں ماضی کو تلاش کرتا ہے۔ ہر انسان اپنے ماضی سے جڑا ہوا ہے۔ اور اپنے حال کو ماضی کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ ماضی کے خوشگوار یا ناخوشگوار احساس سے دامن چھڑانا ممکن نہیں ہوتا۔ بعض اوقات انسان تو جیتے ہی ماضی میں ہیں۔ اور یہ سچ ہے کہ ماضی حال کو جینے کا ایک ایسا خوش گوار عمل ہے، جس کی بدولت حال کا سفر آسان اور مستقبل کی امید قوی ہو جاتی ہے۔ ہر انسان اپنی زندگی میں سوچ

This work is licensed under a [Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)]

سمجھے بغیر بہت سی کیفیات اور احساسات کو جذباتی طور پر محسوس کرتا ہے۔ اچھے برے ہر دور کا تعلق ماضی اور حال سے ہو سکتا ہے۔ناسٹلجیا ماضی کا حسین عکس لیے انسان کا پیچھا کرتا ہے اور پھر اچانک اس کے سامنے ظاہر ہو جاتا ہے۔ناسٹیلجیا بیک وقت اپنے اندر کئی معنی لیے ہوئے ہے۔ گزرے وقت کی یاد، وطن پرستی، وطن سے دوری کا احساس کسی مقام یا گزرے لمحوں کی باز آفرینی وغیرہ۔ اصطلاحی طور پر اس کا مطلب ماضی پرستی یا ماضی پسندی کی ایسی شدید خواہش جس کو فراموش کرنا ناممکن ہو اور جو اپنا تاثر قائم رکھے اور جذبات واحساسات میں ظاہر ہو وہ ناسٹلجیا ہے۔انسان نے تو موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنے اندر ایک اور دنیا بسار کھی ہے۔ جو ماضی کے خواب وخیال اور واقعات وحادثات پر مبنی ہے۔ احمد سہیل ناسٹلجیا کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "ناسٹلجیا کا مفہوم غالباً ہمارے ہاں خانہ اداسی سے لیا جاتا ہے۔ جو یکسر غلط ہے۔ خانہ اداسی سے مرادHome sickness ہے۔ناکہ ناسٹلجیا جو بظاہر لاطینی لفظ معلوم ہوتا ہے۔ حقیقتاً ناسٹلجیا دو یونانی الفاظ Notos بہ معنی واپسی اور Algos جس کے معنی درد کے ہیں، سے مل کر بنا ہے۔ لفظی طور پر ناسٹلجیا کے معنی درد آلود واپسی کے ہیں۔ اس اعتبار سے لفظ ناسٹلجیا کو ہم پس کربیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر یہ کرب ماضی کی جانب واپسی سے مشروط ومنسوب ہے۔"(۱)

ناسٹلجیا کو نفسیاتی عارضہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ اردو ادب میں اس نفسیاتی اصطلاح کو ترقی پسند مصنفین بیماری کہتے ہیں۔ اور اسے ایک ادبی رجحان تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ ان کے نزدیک ہر وہ شاعر یا ادیب اپنے حال سے ناخوش ہوتا ہے۔ اور جنہیں مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ وہ اپنے ماضی میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ اس کو ناسٹلجیا کہتے ہیں۔ ویسے تو یہ اصطلاح بھی مغرب کی عطا کردہ ہے اور مغربی ادیبوں نے اس اصطلاح کا سہارا لیتے ہوئے اپنا کتھارسس بھی کیا ہے۔ نوبل انعام یافتہ ادیب "گیبریل گارشیا مارکیز" ناسٹلجیائی فضا کا ذکر کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

> " دوستی کے بے شمار ناقابلِ تصور اسباب ہو سکتے ہیں مجھے ایسے بہت سے مشہور لوگوں کو جاننے کا موقع ملا جن سے تنہائی کے سو سال پہلے میری ملاقات کا امکان نہیں تھا اور مجھے یہ کسی اور سبب سے نہیں بلکہ صرف ان کی شہرت کے سبب مل سکا بعد میں ہم ایک ایسی یگانیت کے سبب دوست ہو گئے جس کا میری یا ان کی شہرت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس لحاظ سے شہرت ایک مثبت چیز ہے۔ یہ دوستی پیدا کرنے کے ایسے قابلِ قدر مواقع فراہم کرتی ہے جو اس کے بغیر میسر نہیں آسکتے اس کے باوجود اور اپنے دوستوں سے اتنے لگاؤ کے باوجود میں تنہائی کے سو سال سے پہلے کے اپنے دوستوں کو ایک الگ گروہ خیال کرتا ہوں یہ ایک قسم کی خفیہ تنظیم ہے جسے ایک مشترکہ ناسٹلجیا لافانی طور پر یکجا کیے ہوئے ہے۔"(۲)

اردو ادب میں ناسٹلجیائی رجحان کی توجیہہ نفسیات میں ہی پیش کی جاتی ہے۔ کہ ادیب اپنی بیماری کو فن کے اظہار کے ذریعے سے ناسٹلجیا کی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے، کہ اسے درست تسلیم کیا جائے۔ اردو شاعری میں کم وپیش ہر شاعر کے ہاں ماضی پرستی کے رجحانات ملتے ہیں۔ لیکن جن شعراء کے ہاں ماضی پرستی کا رجحان غالب رہا ان میں میر تقی میر، غلام ہمدانی مصحفی، اسد اللہ

خان غالب، مومن خان مومن، حسرت موہانی، فراغ گورکھپوری، جگر مراد آبادی اور اختر انصار دہلوی کے نام نمایاں ہیں۔ جبکہ قیام پاکستان کے بعد کے شعراء میں ناصر کاظمی، احمد مشتاق، منیر نیازی، فیض احمد فیض، مجید امجد، باقی صدیقی اور ن۔م راشد ایسے نام ہیں جن کے ہاں ناسٹلجیائی کیفیات کی فراوانی ملتی ہے۔

اسی طرح اردو نثر لکھنے والوں کے ہاں بھی ناسٹلجیائی رجحان ملتا ہے۔ اور جن اردو نثر نگاروں کے ہاں یہ رجحان زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ ان میں پریم چند، احمد علی، محمود ظفر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چند، عزیز احمد، رام لعل، قراۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے نام نمایاں ہیں۔ تقسیم برصغیر ایک ایساواقعہ تھا۔ جس نے زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام شعبہ جات کے ساتھ ساتھ اردو نثر اور اردو شاعری کو بھی متاثر کیا۔ جن ادبا نے تقسیم کا براہ راست تجربہ یا مشاہدہ کیا ان سب کے ہاں ہمیں ہجرت کے بڑے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان ادیبوں کی تحریروں میں ہمیں تقسیم کا کرب محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح دورِ حاضر کے معروف ناول نگار انتظار حسین کی بات کی جائے تو وہ بھی بار بار ماضی سے اپنے آپ کو کھوجتے ہیں اور اپنے مخصوص انداز میں اپنی جڑوں کو تلاش کرتے ہیں۔ اس غرض کے حصول کے لیے وہ مخصوص علامتوں کا سہارا لیتے ہیں انتظار حسین حقیقت اور خیال کو مجسم کرکے ہمارے سامنے ایک انوکھے انداز میں دنیا کی حقیقت اور قیمتی یادوں کو جدید طرز پر ناول میں پیش کرتے ہیں۔ ماضی کی خوبصورت یادوں میں کھو کر حال اور مستقبل کی کڑیوں کو آپس میں ملاتے ہیں۔ جس رنگ کو جس طرز کو اور جس روایت کو بانو قدسیہ نے راجہ گدھ میں قرۃ العین حیدر نے ناول آگ کا دریا اور کار جہاں دراز میں زندہ رکھا اسی روایت کو انتظار حسین نے اپنے ناول بستی، تذکرہ اور آگے سمندر ہے میں برقرار رکھا۔ یہ وہ ادیب تھے جن کو براہِ راست ہجرت کا تجربہ ہوا اور پھر ساری زندگی اسی تجربے کے سائے میں فن کو تخلیق کرتے رہے۔ معروف نقاد احمد ہمدانی انتظار حسین کے ناسٹلجیا کے بارے میں عمومی طور پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "وہ تمام انکشافات اور مشینی ایجادات کو ذہنِ انسانی کا کارنامہ سمجھنے کے بجائے انسانیت کی پستی سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ وہ اپنی کوٹھری اور کوٹھری کے باہر کی فضا میں ربط دینے کو ضرورت کا نظر انداز کرکے صرف ماضی کی چھاؤں میں ستانے بلکہ سو جانے کو کافی سمجھتا ہے۔"(۳)

انتظار حسین کے ناول "آگے سمندر ہے" کو ناسٹلجیا کے تناظر میں دیکھا جائے، جو کہ ان کے پہلے ناول بستی کی ہی توسیع شدہ شکل ہے تو ناول "آگے سمندر ہے" کی کہانی، اس کے کردار مکمل طور پر ناسٹلجیک فضا میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ناول کی کہانی حقیقت اور مصنف کے ذاتی تجربات پر مبنی ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار جواد ماضی کی یادوں کو ایک بار پھر سے جینے کی خاطر اپنے آبائی وطن کا سفر کرتا ہے تاکہ وہ ان سب یادوں کو ایک دفعہ جی بھر کے جی سکے، محسوس کر سکے۔ اپنی ان "فرسودہ" یادوں کو پھر سے تازہ کر سکے۔ ناول کا مرکزی کردار ان تمام خوبصورت یادوں کو جو کہ اس کے لاشعور میں ہر وقت ایک خوبصورت احساس کے طور پر ابھرتی رہتی تھیں اُن کو پھر سے جینے کی خاطر ان یادوں کو اکٹھا کرنے کی خاطر آبائی وطن کا سفر کرتا ہے۔ ناول کی کہانی تاریخ اور سیاسی صورت حال سے جڑی ہوئی ہے مرکزی کردار جواد (براہ راست تقسم کا تجربہ کار) قیام پاکستان کے وقت ہندوستان سے پاکستان میں آبسا ہے اور یہاں زندگی گزارنے کے لیے اس نے کراچی جیسے جدید شہر کو چنا ہے، جس میں ناول دارالحرب کی کیفیت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یعنی اس شہر

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

میں قتل وغارت چوری، ڈاکے اور گولیوں دھماکوں کی آوازوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قرطبہ، غرناطہ جیسے شہروں کی تاریخ کو اس سے جڑے واقعات اور یادوں کو پورے ناول میں مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا ہے اس ناول میں اکثر کرداروں سے جواد اپنے ماضی کے قصے بیان کرتا ہے۔ ایک دوسرا بڑا کردار اس ناول میں مجید الحسینی عرف مجو کا ہے۔ جو کہ جواد کے ساتھ فلیٹ میں رہتا ہے مجو کے بہت سے لوگوں سے تعلقات ہیں اور وہ ایک آزاد طبیعت کا شخص ہے۔

اس ناول میں جواد کو ماضی کی تلخ و شیریں یادیں ستاتی رہتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے ایک یاد دوسری یاد کو اپنے اندر نگل رہی ہے۔ یہ ناول اسلامی ممالک کے کھوئے ہوئے اسلامی دائرے کے وژن کے ساتھ معاصر کراچی کے شہری زندگی اور پُر تشدد حالات کا موازنہ کرتا ہے۔ مصنف نے کراچی میں رہنے والے مہاجرین کی زندگی کو پیش کیا کہ کس طرح ماضی کے قصے ان کی ذات کو کھوکھلا بنا رہے ہیں۔ ناول آگے سمندر ہے میں ہمیں انتظار حسین کے باقی ناولوں کے برعکس ایک الگ منظر نامہ ملتا ہے۔ اس ناول میں لوگوں کی اس حالت کو بیان کیا گیا ہے جب قیام پاکستان کو اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی لوگ کراچی جیسے شہر میں اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مہاجر لوگ مکمل طور پر اس نئی زندگی کو اپنا نہیں سکے اتنے بڑے شہر میں بھی وہ خود کو اکیلا ہی محسوس کرتے ہیں۔ یہ لوگ جب بھی اپنے جیسے مہاجر سے ملتے ہیں، ملاقات کرتے ہیں، تو ماضی کو سوچ کر اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو اپنی روایات اور رشتوں کی پامالی کو یاد کر کے افسردہ ہو جاتے ہیں۔

جدید دور میں بھی ناول کے کردار اپنے ماضی سے جڑے ہوئے ہیں۔ جیسے ہی کوئی واقعہ رونما ہوتا، ہر کردار اپنے ماضی کی یادوں میں گم ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ انتظار حسین نے ناول میں جدید دور کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی مسائل کو بھی ماضی کی یاد سے جوڑا ہے۔ ناول کا آغاز انتظار حسین نے احمد مشتاق کے ایک خوبصورت شعر سے کرتے ہیں۔ جو بڑی معنویت کا حامل ہے۔

وہی گلشن ہے لیکن وقت کی رفتار تو دیکھو
کوئی طائر نہیں پچھلے برس کے آشیانوں میں

اس شعر میں بھی یاد ماضی، وقت کی رفتار اور بچھڑے ہوؤں کی یاد پر افسردگی کا اظہار شامل ہے۔ ناول میں ناسٹلجیائی فضا کا آغاز تو انتظار حسین یہاں سے ہی کر دیتے ہیں۔ ناول میں سارے واقعات ایسے ہی ملتے ہیں، جو ماضی پرستی کی گواہی ہیں۔ ناول کے پہلے جملے میں ہی گزرے زمانے کا ذکر ہو رہا ہے یعنی آغاز ہی میں بات ماضی کے واقعات سے کی جا رہی ہے اقتباس دیکھیے:

> "یہ اصل میں اس زمانے کا ذکر ہے جب عبد الرحمن اول کے بوئے ہوئے کھجور کے درخت پر سوا دو سو برس گزر چکے تھے۔ صحرائے عرب کی حور اندلس میں رچ بس چکی تھی۔ قرطبہ اشبیلیہ، غرناطہ، طلیطیلہ کے گھروں کے صحن اب اس کے اپنے گھر تھے۔۔۔۔ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور تم اسے کہاں لے گئے۔"(۴)

ناول کے آغاز میں واضح طور پر ماضی کے قصے کو یاد کیا جا رہا ہے۔ یہاں مرکزی کردار جواد پرانی باتوں کو شروع کرتا ہے، اور بات بات پہ اپنے ماضی میں گم دکھائی دیتا ہے۔ جس پر اس کا دوست مجو اسے ہر بار کی طرح ٹوک دیتا ہے۔ اور اعتراض بھی کرتا ہے کہ بات کچھ بھی ہو اس کی کڑی تم یہاں (ماضی) ہی میں جوڑتے ہو۔ جب کہ جواد کا کردار پورے ناول میں ہی اسی طرح پیش کیا گیا ہے کہ وہ ماضی کے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

حسین لمحوں کی یاد میں کھویا ہوا ملتا ہے۔جواد میرٹھ کے ایک چھوٹے سے قصبے ویاس پور سے کراچی ہجرت کر کے رہائش پذیر ہوتا ہے ۔لیکن روحانی طور پر وہ وہی اپنے چھوٹے سے قصبے ویاس پور میں زندہ رہتا ہے۔ بچپن کی یادیں اس کو ستاتی ہیں۔ان یادوں کو وہ پھر سے جینا چاہتا ہے وہ دوبارہ اپنی جنم بھومی کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اور پھر ایک روز اسے خبر ملتی ہے کہ ہندوستان میں رہ جانے والی اس کی پھوپھی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس طرح اسے اپنے وطن واپس جانے کا ایک بہانا مل جاتا ہے۔ جواد اپنی جنم بھومی کا سفر شروع کرتا اور ان گنت یادوں کو تازہ کرتا ہے، لیکن اس کا یہ تجربہ خوشگوار ثابت نہیں ہوتا۔ گاؤں کی صورتحال بدل چکی تھی۔ پرانی حویلیوں کی جگہ جدید گھروں نے لے لی تھی، گاؤں کی قدریں زوال آمادہ تھیں، مانوس چہروں کی جگہ نئے چہرے آباد ہو چکے تھے۔ جواد کا یہ سفر ناول کی فضا کو ناسٹلجیا سے پُر کر دیتا ہے۔ جواد کا ہندوستان میں اپنے گھر پہنچ جانے اور پہلی رات گزارنے تک کا سفر کافی تکلیف دہ رہتا ہے۔ آہستہ آہستہ بچپن کی یادیں تازہ ہونے لگتی ہیں۔ مثلاً اقتباس دیکھیے کہ:

> "میرے ساتھ یہی ہوتا ہے، لگتا ہے کہ مجھے پچھلی کوئی بات یاد نہیں ہے مگر کسی کسی وقت یادیں اس طرح امنڈتی ہیں کہ میں ان میں بہتا چلا جاتا ہوں۔" (۵)

اس اقتباس میں ناول کا مرکزی کردار خود اپنے اندر کے ناسٹلجیائی رویے کا اظہار کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ کس طرح چھوٹی چھوٹی یادیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی اکثر تو یادیں غائب ہو جاتی ہیں لیکن اچانک ہی یادوں کا ایک پنڈورا باکس کھل جاتا ہے۔ ہجرت کے وقت جواد کو اپنی محبت کی بھی قربانی دینی پڑی تھی۔ اب جب کہ وہ ہندوستان واپس لوٹا ہے، تو اس کی وہ یادیں حسین لمحے دوبارہ تازہ ہو گئے ہیں۔ یہاں پہ "میمونہ" سے دوبارہ ملاقات جواد کو پھر سے ماضی میں لے جاتی ہے۔ میمونہ کے ساتھ گزرا وقت دوبارہ سے جواد کے نہاں خانوں میں تازہ ہو جاتا ہے۔ وہ بچپن کے دن جو انہوں نے ساتھ گزارے تھے۔ وہ باتیں، وہ کھیل، وہ کھانے، سب تہوار ایک حسین منظر کی طرح پھر سے اس کے ذہن کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ اقتباس دیکھیے کہ:

> "ایک برسات، دوسری، تیسری برسات ایک دم سے ہمیں کتنی برساتیں اکٹھی یاد آ گئی تھیں۔، جیسے گہری گھٹا امڈ آئی ہو۔ یادوں کی گھٹا بھی کتنی ظالم گھٹا ہوتی ہے۔ ہم جیسے پھر سے بچے بن گئے ہوں۔ میمونہ اور منن جواد کا(Nick Name) ایک دوسرے کی انگلی پکڑے کہاں سے کہاں نکل گئے۔ اس دن کتنی بارش ہوئی تھی۔" (۶)

مندرجہ بالا اقتباس میں بچپن کی یادوں کا گہرا عکس دیکھا جا سکتا ہے، جس نے ہندوستان پہنچتے ہی جواد کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ اس سارے ناول میں جواد ان یادوں کو منظر عام پر لاتا ہے۔ جو کہ اس کے لاشعور میں موجود تھیں۔ جن کو جواد خود میں اکٹھا کرنا چاہتا تھا ۔لیکن ماضی میں گزری کچھ ایسی یادیں بھی تھیں۔ جن کو وہ دوبارہ اپنی جھولی میں سمیٹ نہ سکا، کیونکہ حالات کروٹ لے چکے تھے۔ وقت کی رفتار تیز تر ہو چکی تھی۔ تنگ و افلاس نے جگہ جگہ ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ جس وجہ سے وہ پیار، محبت اور سکون جو پہلے تھا۔ اب وطن کی مٹی سے وہ سب محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ جس مٹی سے اس کو ماں جیسی ممتا کا احساس ہوتا تھا۔ اب اس میں وہ خوشبو باقی نہیں رہی تھی ۔جن یادوں کو وہ دوبارہ سمیٹنا چاہتا تھا۔ جن کو سوچ کر وہ بے قرار ہو جایا کرتا تھا۔ اب انہی گھروں کھیتوں اور لوگوں کو دیکھ کر اس کے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

تاثرات میں حیرت انگیز مایوسی شامل ہو رہی تھی۔ کیونکہ راوی خود ناول میں اپنی اس حالت کو بیان کرتا اور کہتا ہے۔ اب یہ علاقہ، اب یہ میرٹھ وہ میرٹھ نہیں رہا جس میں میں نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔ میرٹھ جس دھرتی پر جواد نے جنم لیا تھا۔ اس زمین پر واپس لوٹنے پر اس کی پہچان اب یہ رہ گئی تھی کہ وہ پاکستان سے آیا ہے۔ یہ وہ جواد ہے، جو پاکستان سے آیا ہے یہاں ہندوستان میں جواد نے وقت کا بہاؤ محسوس کیا تھا کہ وقت کس تیزی سے گزرا ہے، کتنے ہی جوانوں کو بڑھاپے نے گھیر الیا ہے۔

اس ناول میں ماضی کی یاد ماضی کے قصے ماضی کے احساسات کو محسوس کرنے کی خاطر انتظار حسین نے واپسی کا سفر کروایا۔ لیکن اس سفر میں جواد کو جہاں خوشی محسوس ہوئی اپنی دھرتی کو عرصے بعد دیکھ کر تو اس خوشی پر مایوسی کا غلبہ بھی چھایا رہا اور اس غلبے کے ساتھ جواد واپس پاکستان لوٹا۔ یہاں دیکھتا ہے تو حالات یہاں بھی کشیدہ نظر آتے ہیں۔ جواد حیران ہوتا ہے، کہ وہ اتنا وقت وہاں گزار آیا کہ وقت نے دوڑ ہی لگا دی۔ اور شہر کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ خیر یہ حیرت تو جواد کو کچھ دن بعد ہوئی۔ جب وہ میرٹھ کے سحر سے نکلا لیکن واپس آجانے کے بعد بھی ہندوستان اس کے حواس پر چھایا رہا۔ اقتباس:

> "واپس آنے کے بعد کچھ دنوں تک میں اسی سحر میں رہا۔ لگتا تھا کہ ابھی وہیں ہوں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ خواب دیکھتے دیکھتے اچانک آپ کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ تو کھل گئی مگر ذہن ابھی تک اسی فضا میں بھٹک رہا ہے۔"(۷)

اس ناول میں صرف جواد ہی ناسٹلجیا کا شکار نظر نہیں آتا، بلکہ میمونہ (مونہ) اور "بڑی بھابی" کے علاوہ "چھوٹی پھپھی" کا کردار بھی ناسٹلجیا میں گھرا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ فطری طور پر انسان اپنی زندگی کے کسی بھی حصے کو فراموش نہیں کر سکتا، یہ کوئی ذہنی خلل نہیں بلکہ ناسٹلجیا ہے، جو ہر انسان کے ساتھ ساری زندگی چلتا رہتا ہے۔ اس ناول کا ایک حصہ تاریخ سے جڑا ہوا ہے، جس کا انتظار حسین نے دور حاضر کے حالات سے تقابل کیا ہے۔ اس تاریخی شعور کو بہترین انداز میں پیش کرنا ایک بڑا معرکہ ہے۔ جو کہ انتظار حسین کا خاصا ہے۔ تاریخ دان تاریخ کو بیان کر دیتے ہیں کہ آج سے پہلے کیا ہوا، لیکن اس تاریخ کو دور حاضر کے تقاضوں سے جوڑ کر فرق بتانا اور ایک سبق کے طور پر پیش کرنا یہ طریقہ بہت کم لوگوں نے اپنایا۔ انتظار حسین اپنے انداز میں تاریخ کے عمل میں ٹوٹتی بگڑتی تہذیبوں کے نوحہ خواں ہیں۔ یہ آہ و پکار جڑوں سے کٹ جانے کا واویلا نہیں ہے بلکہ ان کی تلاش کا عمل ہے۔ اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں سمیت اپنے ماضی کو حاصل کر لینے کی کوشش ہے۔

کراچی کے حالات کو جواد اپنے بچپن سے جوڑتا دکھائی دیتا ہے کہ آج جس طرح کا سناٹا شہر میں پھیلا ہوا ہے ایسا ہی سناٹا اس کے بچپن میں جب تک اس کی بستی میں بجلی نہیں تھی اور شام ہوتے ہی ہر طرف ہو کا عالم ہوتا تھا۔ اسی طرح جواد بتاتا ہے کہ بچپن کے سناٹے کے بعد جو سناٹا میرے تجربے سے گزرا وہ ۱۹۴۷ء کے آس پاس کے زمانے کا تھا۔ لیکن اب بھی شہر میں سناٹا ویسا ہی چھایا ہوا ہے۔ دیکھیے کہ:

> "ویسا ہی سناٹا مگر ایک نئی دہشت کے ساتھ۔ ہر عہد اپنا سناٹا اپنی دہشت اور ہاں اپنا تشدد اپنے ساتھ لاتا ہے"(۸)

مزید ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اے یار اب تو آئے دن ہی میں اس شہر میں ایسا کچھ دیکھتا ہوں کہ میری پراگندہ خاطری بڑھ جاتی ہے۔ اور دل میں سو طرح کے اندیشے گزرتے ہیں۔ میں زمانے کی الٹ پھیر کو دیکھتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں۔"(۹)

ناول کے اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماضی کے کس سانحے کو یاد کیا جارہا ہے۔ ہجرت کا دور ہر عام انسان کے لیے تکالیف و مشکلات سے اٹا ہوتا ہے۔ اس ناول میں انتظار حسین نے اسلامی ممالک کے قانون اور اصولوں کی یاد دہانی بھی کروائی ہے۔ آج کل اسلامی ممالک اور ان کی پالیسیاں کس معاشرے کو پروان چڑھا رہی ہیں۔ آج کی مسلمان قوموں نے اپنا اصل مقام و مرتبہ کس طرح فراموش کر دیا ہے، اپنے نام و ناموس کو کس طرح ملیامیٹ کر دیا ہے۔ ناول میں مصنف نے اپنی پسندیدہ تکنیک یعنی علامتوں اور اساطیروں کا استعمال بھی کیا ہے۔ وہ اندلس میں مسلمانوں کی حکومت کے زمانے کے قصے اور مثالیں پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ اور اپنے عظیم بزرگوں کو بھی یاد کرتے ہیں، جنہوں نے وطن کے وقار کو قائم رکھنے کی خاطر، وطن کو بچانے کی خاطر قربانیاں دی تھیں۔ انتظار حسین نے اس ناول میں ماضی کی یادوں سے انسانی تعلق کی مضبوطی کو ظاہر کیا، جدید دور کی تیز رفتاری کے پیش نظر جن اقدار کو ہم بھول رہے ہیں ان کو دوبارہ یاد کروانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً، لکھتے ہیں کہ:

"ایک وقت کشتیاں جلانے کا ہوتا ہے۔ اور ایک وقت کشتی بنانے کا۔ وہ وقت پیچھے رہ گیا جب ہم سے اگلوں نے ساحل پر اتر کر سمندر کی طرف پشت کر لی تھی اور اپنی ساری کشتیاں جلا ڈالی تھی۔ اب بھر تا سمندر ہمارے پیچھے نہیں، ہمارے سامنے ہے اور ہم نے کوئی کشتی نہیں بنائی۔"(۱۰)

مندرجہ بالا اقتباس ناول کا نچوڑ ہونے کے ساتھ ناسٹلجیا کی وہ کڑی بھی ہے۔ جس میں یادوں سے سبق سیکھ کر حال کو بہتر بنایا جا سکتا ہے، مستقبل کی راہیں متعین کی جاسکتی ہیں۔ پورے ناول میں ماضی کے حسین دور اور انسانیت پرستی سے بھرپور معاشرے کو آج کے دور سے جوڑنے کی کوشش کی ہے کہ یہ لوگ جو آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو چکے ہیں۔ یہ انھی عظیم روایات کی حامل شخصیات کی نشانیاں ہیں۔ جنہوں نے وطن کی خاطر اپنی قیمتی جانوں کی قربانیاں دی تھیں۔ ہم سے پہلے آنے والوں نے شہروں کو آباد کیا تھا اور آج جدید دور کا انسان اپنی ہوس میں اپنے سکون کی خاطر پھول جیسی زندگیوں کے لیے خوف کی علامت بنا ہوا ہے۔ ناول کا بنیادی بیان کردہ مسئلہ بھی یہی ہے۔ انتظار حسین نے ناول میں ان اقدار کو اجاگر کرنے کی کوشش ہے جو ماضی کی حسین یادوں کے طور پر ہمارے پاس موجود ہیں۔ اور جنہیں جدید دور میں پیش آنے والے نئے چیلنجز کا سامنا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اب تو سمندر ہمارے عقب میں نہیں بلکہ سامنے ہے۔ جس کو پار کرنے کے لیے کوئی حکمت عملی نہیں بنائی گئی، کوئی ایسا راستہ نہیں بنایا جہاں ہم اب آنے والی نسلوں کے لیے آسانیاں پیدا کر سکیں۔ ناول کا ایک اور ضمنی کردار مرزا دلاور حسین شہر کی اس تشویش ناک صورتحال کو دیکھتے ہوئے ماضی کے واقعے (طارق بن زیاد) کو دہراتا ہے اور پھر کراچی شہر کی صورتحال کو دیکھتے ہوئے اپنی رائے پیش کرتا ہے، جو کہ دیکھا جائے تو ناول کا ایک حصہ ہے۔ لیکن اس واقعے کی طرف نشاندہی ماضی کے واقعات کو اپنی ذات کا حصہ بنائے رکھنا یہی ماضی پرستی ہے۔ اور بیشتر انسان اس فضا میں ساری زندگی کسی نہ کسی طور مقید رہتے ہیں۔ ناول کے سبھی کردار اور خاص طور پر جواد ناول میں مسلسل اپنی یادوں میں کھویا

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 01, June 2024

ہوا نظر آتا ہے۔ناول کی ساری کہانی ہی ناسٹلجیائی فضا میں گھری ہوئی ہے۔ناول میں جواد اور اس کا دوست کراچی شہر کے بگڑتے حالات دیکھتے دیکھتے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔جواد کو کسی نامعلوم افراد کی گولی لگتی ہے، تو مجو بھائی بھی بم دھماکے میں شہید ہو جاتا ہے۔ یوں یادوں کا جو پنڈورا بکس پورے ناول میں جواد کے کردار کے ساتھ ساتھ چلتا آرہا تھا۔اس کے مرنے پر وہ بند ہو جاتا ہے۔چونکہ ماضی کی یادوں سے اور ماضی سے جڑے کسی بھی احساس سے انسان چاہتے نہ چاہتے ہوئے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔یادیں انسان کے شعور اور لاشعور میں زندہ رہتی ہیں، زندگی کے کسی بھی موڑ پر انسان ان یادوں میں کچھ دیر کے لیے پناہ تلاش کرتا ہے۔انسانی ذہن کبھی بھی اپنے ماضی کو فراموش نہیں کر سکتا، اور یہی ناسٹلجیائی رنگ ہمیں انتظار حسین کے ناول "آگے سمندر ہے" میں باقی ناولوں کی نسبت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔بعض لوگوں کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ انتظار حسین ماضی پرستی کی وجہ سے نئے ماحول میں اپنے پیر نہیں جما سکے۔اپنی اسی ذہنی کیفیت اور رویے کے بارے میں اکثر انتظار حسین کہا کرتے تھے کہ وہ ۱۸۵۷ء کے گمشدہ سپاہی ہیں۔ان کا یہ رویہ ہمیں ان کی تحریروں میں صاف دکھائی دیتا ہے۔ان کے مذکورہ ناول "آگے سمندر ہے" میں بھی وہ جدید دور میں بیٹھ کر پرانے وقت کے قصوں کو ناول میں سمیٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔اس ناول میں بھی وہ خوشگوار یادوں کو دوبارہ جینے کے لیے اپنے دیس کو پلٹتے ہیں۔لیکن جس جنت کی تلاش میں جاتے ہیں وہاں وہ حاصل نہیں ہو پاتی۔ناول میں انتظار حسین قدیم سے جدید دور کے تقاضوں کا تقابل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔احمد سہیل، اردو افسانے کا ناسٹلجیا، مشمولہ، ذہنِ جدید، شمارہ ۱۰، ۱۹۹۵ء، ص ۳۲،۳۳

۲۔گیبریل گارشیا مارکیز ، منتخب تحریریں ،اجمل کمال، مترجم، آرٹ پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص ۶۱۴،۶۱۵

۳۔احمد ہمدانی، سلسلہ سوالوں کا، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۳۶،۳۷

۴۔انتظار حسین، آگے سمندر ہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۵۰

۵۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۶۔ ایضاً، ص ۱۳۷

۷۔ ایضاً، ص ۱۶۰

۸۔ ایضاً، ص ۱۸۳

۹۔ ایضاً، ص ۳۰۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۰۸

References in Roman Script:

1. Ahmed Sohail, Urdu Afsany Ka Nostalgia, Mushmola , zehn -e- jaded, shumara, 10, 1995 , P. 32-33
2. Gabriel García Márquez ,Muntakheb tehrerey: Ajmal Kmal (Mutarjam), Gabriel García Márquez , Karachi, Art publications, third edition,2011,P. 614-615
3. Ahmed hamdani, silsila swalon Ka, Karachi, maktabh Aslob ,1986, P.36-37

4. Intzar Hussain, Aagy smandar ha, Lahore: sang-e-meel publications, 2016, P. 05
5. Ibid, P.132
6. Ibid, P.137
7. Ibid, P.160
8. Ibid, P.183
9. Ibid, P.304
10. Ibid, P.308

Mr. Saqlain Ahmad Khan received the M. Phil degree in Urdu. He is currently a lecturer in the department of Urdu, Islamia University, Bahawalpur. He has written 03 articles on Urdu criticism, a subject of his interest.

Mr. Muhammad Burhan Hassan completed his M. Phil degree in Urdu. He is currently working at Government College University, Lahore as a Visiting Lecturer. Over 03 articles by him have been published. His research interest includes Urdu fiction and Urdu criticism.